وہ خدا کے قانون کی سربلندی کے لیے کوشش کرتا ہے اور غیر الٰہی قوانین میں یہ تفریق نہیں کرتا کہ انہیں کوئی سامراجی حاکم نافذ کرتا ہے یا اپنے ہی ملک کا کوئی مسلمان نامی حاکم۔ وہ دونوں کے خلاف خدا کی رضامندی اور شریعت کی حفاظت و بقا کی خاطر نبرد آزما ہونے سے خوف نہیں کھاتا، اور اسلامی ملکوں میں وہ صرف قانونِ اسلامی کا نفاذ چاہتا ہے، اس لیے کہ اس کے ذریعے سے اُمتِ اسلامیہ خدا کی رضا و رحمت کی مستحق بھی ہوگی اور قانونِ اسلامی کے صالح اور مفید عام تجربہ کو زندہ دیکھ کر ساری انسانیت اپنی دائمی پریشانیوں اور لاعلاج مشکلات کے لیے اس کی خدمات قبول کرے گی (جیسے کہ طلاق کے سلسلے میں ساری انسانیت نے کی)۔ مومن کا مقصدِ حیات اس دنیا میں خلافت کا قیام ہے، اور وہ دعوت الی اللہ کے ذریعے اور اسلامی قانون کی دائمی صلاحیت کے ذریعے پوری انسانیت کی جھولی اسلام کی لازوال دولت اور قانونِ شریعت کی باکمال نعمت سے مالا مال کرنا چاہتا ہے تاکہ بحر و بر میں رونما ہو جانے والے فساد اور سیلاب بلا کا خاتمہ ہو اور ظلمتِ انسانیت کی طویل شبِ فراق نورِ ایمان کی صبح وصال سے پھر ہم کنار ہو۔

ایسے مومن و مسلم کے سامنے یہ بحث بالکل بے کار ہے کہ انگریزوں نے اسلامی کریمنل لا کو ختم کر دیا تھا اس لیے اب ہم پرسنل لا کو بھی ختم کر دیں۔

دوسرے سوال کی حقیقت بھی پہلے سوال کے جوابات کے ساتھ واضح ہو گئی، تاہم یہ بتانا ضروری ہے کہ:

۱۔ کسی نام نہاد اسلامی ملک میں اگر اسلام کے پرسنل لا سے متعلق کوئی تبدیلی ہوئی ہے تو وہ قانونی طور سے حجت نہیں، اور شرعی طور پر اگر کتاب و سنت کے خلاف ہے تو باطل اور کالعدم ہے، اس کی پیروی کسی دوسری اسلامی حکومت میں کیسے ہو سکتی ہے۔

۲۔ کیا یہ تبدیلیاں علمائے اسلام کی رائے اور مسلم عوام کے جذبات کے ماتحت رونما ہوئی ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ مغرب زدہ حکومتوں کے اعلیٰ افسران کی اپنی من مانی ہے، اور کسی بھی شخص کی من مانی حرکات شریعت میں حجت کا درجہ نہیں رکھتیں۔

۳۔ بفرض محال عوام ہی کی مرضی اور رائے شماری اور ووٹنگ کے ذریعے بھی اگر کوئی تغیر و تبدل کیا گیا ہو، اور وہ کتاب و سنت کے خلاف ہو تو شریعت کی نظر میں کالعدم ہے۔

۴۔ یہ دعویٰ بھی گمراہ کن ہے کہ مسلمان ملکوں میں پرسنل لا تبدیل کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر اسلامی ممالک میں پرسنل لا کے اندر کسی قسم کی بنیادی تبدیلی اب تک نہیں ہو سکی ہے۔ مغربی افکار کے دلدادوں کی طرف سے کوششیں ضرور شروع ہوئی ہیں، لیکن اکثر جگہ وہ ناکامی کی شکار ہوئی ہیں۔

۵- اکثر جگہوں پر حالات حاضرہ کے ساتھ جائز حد تک توافق کی صورتیں پیدا کرنے کی غرض سے فقہ اسلامی کے دوسرے مذاہب سے بھی مدد لی گئی ہے، اور کسی ایک فقہ تک قانون کو محصور نہیں رکھا گیا ہے[1]۔ مصری مقنن نے بھی یہی کیا ہے۔ پہلے اسلامی قانون کا ماخذ عام طور پر حنفی مذہب تھا، لیکن بعد میں اس اساس میں حالات وضروریات کے مطابق فقہائے امت کی آراء اور فقہی استنباطات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ لیبی مقنن بھی آج کل یہی کر رہا ہے۔ فقہ مالکی کو اساس بنا کر بوقت ضرورت کے مطابق دوسرے مذاہب وفقہی آراء سے استفادہ کیا جا رہا ہے، اور یہ طریقہ صحیح بھی ہے اور مناسب حال بھی۔ کیونکہ ساری دنیا پر محیط اور سارے مسلمانوں کے لیے قطعی طور پر قابل عمل اسلامی قانون میں تعصب، تنگ نظری اور مذہبی تفوق وپندار کی بو کا ہونا کوئی ایسی مستحسن بات بھی نہیں۔ لیکن ہاں فقیہ شہر اگر یہ چاہتا ہے اور اس پر راضی ہے کہ اسلامی قانون کے دائرے کو تنگ سے تنگ تر کرے تاکہ پھر مسائل کے حل کے لیے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کے بجائے لاتینی، انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور امریکی روشنداوں کی طرف دیکھنا پڑے تو اسے شوق سے مشق ستم کی اجازت ہے اور دعوت تعصب کو پروان چڑھانے کا موقع بھی میسر ہے۔

تمام مذاہب فقہ حق پر قائم ہیں اور حق کی قدریں ان میں مشترک ہیں، اہل سنت وفقہ کے اس قول میں صاف

---

[1] فقہی اصطلاح میں اس عمل کو "تلفیق" کہتے ہیں۔ اس کے لغوی معنی بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں،

"لَفقَ الثوب الفقہ لفقا وھو ان تضم شقۃ الی اخری فتخیطھما، ولفق الشقتین یلفقھما لفقا، ولفّقھما ضم احداھما الی الاخری فخاطھما" (لسان العرب۔ ۱۲-۲۰۶) ترجمہ: "کپڑے کو لفق کیا یعنی ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے سے ملا کر سی دیا، اور دو ٹکڑوں کو لفق کیا یعنی دونوں کو آپس میں ایک دوسرے سے جوڑا اور پھر سی لیا"۔ فقہی تلفیق کے معنی بھی اصلی اور لغوی معنی ہی کے قریب ہیں یعنی دوسرے مذاہب فقہ سے استفادہ اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کو ملانا۔ کیونکہ کپڑے کے دو قطعوں کو بھی ضرورت کے وقت ہی ملا کر سیا جاتا ہے، بلا ضرورت یہ کام نہیں کیا جاتا۔ احادیث ملفقہ عام طور پر احادیث کاذبہ کو کہا جاتا ہے، اور یہ بھی لغوی معنی ہی سے ماخوذ ہے، کیونکہ واضع حدیث سچ بات میں یا تو کچھ جھوٹ ملا دیتا ہے یا بات اپنے من کی بیان کرتا ہے لیکن اس کی نسبت حضور نامدار کی طرف کرکے اس میں جھوٹ کی آمیزش کر دیتا ہے۔ لفق کے اصل معنی جھوٹ یا کذب کے نہیں بلکہ ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانے کے ہیں۔ اگر یہ آمیزش ایک صحیح چیز میں صحیح چیز کی ہے تو تلفیق ہے اور اگر یہ ملاوٹ غلط چیز کی ہے تو کذب کے معنی اپنے اندر رکھتی ہے۔

اور واضح اجازت اس بات کی ہے کہ سارے مذاہب سے استفادہ کیا جانا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ضرورت کے وقت مستحسن اور ضروری ہے، اور کسی غیر اسلامی قانون سے اخذ کرنے کی صورت میں تو واجب اور فرض ہو جاتا ہے۔

یہاں تک تو مسئلہ کا پہلو بہت اچھا ہے لیکن اس سلسلے میں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے:

(الف) ایک تو یہ کہ عام قانون کی بنیاد کسی ایک فقہی مذہب پر قائم کی جائے، اور ملک کے عام فقہی مذہب کی رعایت رکھی جائے تاکہ عوام میں بے دلی اور عدم اطاعت کے جذبات نہ ابھریں۔

(ب) یہ اس صورت میں اور اس وقت تک کے لیے ضروری ہے جب تک کہ ممالک اسلامیہ میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم ہیں۔ جب خلافت اسلامیہ قائم ہو جائے اور پورے عالم اسلامی میں ایک خلیفہ کا حکم نافذ ہو جائے اور ایک حکومت بن جائے تو اس وقت خلیفہ وقت تمام علمائے امت کے اجتماع کے ذریعے فقہائے امت کے اقوال و مذاہب اور اجتہاد و استنباط کے شرعی طریقوں سے مکمل اسلامی قانون بنانے کا مجاز ہوگا، اور کسی ایک مذہب فقہ کو بنیاد بنانے والی شرط اس صورت میں ختم کی جا سکتی ہے۔

(ج) عام حالات میں محض آسانیاں اور سہولتیں تلاش کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ دلائل و براہین کی روشنی میں اقوال کو اخذ کیا جائے۔

(د) شدید ضرورت کے وقت یا خصوصی حالات و مسائل میں آسانی کی خاطر بھی کسی مسئلہ کو قبول کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ متروک اور بالکل بے دلیل نہ ہو، اور مقصود اصلاح ہو، اور اسلامی نقطہ نظر کام کر رہا ہو اور اخلاص ہو، کسی مشرقی یا مغربی نقطہ نظر کی وجہ سے توڑ مروڑ کر یا غیر سائغ فی الشرع (شریعت میں غیر مقبول) تاویلات کے ذریعے نہ ہو۔

(ر) سب سے اہم اور سب سے ضروری شرط جس کے بغیر کسی قسم کی تلفیق، استنباط، قیاس اور اجتہاد نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ کہ یہ کام علماء و مفکرین اسلام کی اجتماعی آراء سے ہو، اور کسی ایک ملک کے علمائے کرام کا اجماع یا امت اسلامیہ کے علماء کا اجماع کسی مسئلہ پر اگر ہو جائے تو پھر وہ کسی بھی مذہب فقہ سے لیا جا سکتا ہے۔ اجماع کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی غیر شرعی چیز پر اجماع اس کو شرعی بنا سکتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ مسئلہ یا تو پہلے سے کسی مذہب فقہی میں جائز ہو، یا پھر نئے مسائل میں استنباط مسائل کے شرعی طریقے استعمال کیے جائیں جنہیں فقہاء و علمائے امت ہر ملک میں جانتے ہیں۔ نیز اجماع کا لفظ یہاں میں نے بمعنی اجتماع بھی لیا ہے، یعنی علمائے امت کی اکثریت اس کو قبول کرلے۔ اس صورت میں اس مسئلہ کو دوسرے مذہب فقہ میں سے اخذ کرنے کے بعد قانون میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ ہرگز صحیح

نہیں ہوسکتا کہ اجتہاد کی شرطوں، عربی زبان کی باریکیوں اور بلاغتوں اور فقہ اسلامی کے مذاہب سے بے خبری کے ساتھ ساتھ ہر عامی شخص کو اس طرح کی اجازت دے دی جائے اور جس کا جو جی چاہے وہ عمل شروع کردے۔ یقیناً یہ شریعت پر ظلم کے مُرادِف ہوگا، کیونکہ یہاں تو ہم قانونی معاملات پر گفتگو کر رہے ہیں، عبادات اور ان اشیا تک میں جن کا تعلق خدا اور بندے کے درمیان ہے ان میں بھی عوام کو تقلید ہی کا حکم ہے، صرف مجتہد کو امام اعظم کے نزدیک اس بات کا اختیار ہے کہ چاہے تو تقلیدِ مجتہد کرے اور چاہے تو اپنے اجتہاد پر عمل کرے، اور امام شافعی نے عامی پر تقلید اور مجتہد پر اپنے اجتہاد کے موافق عمل واجب کیا ہے[1]۔ اس لیے قانونی اشیا میں عوام کو اختیار اور پسند کا حق نہیں دیا جا سکتا، اور اسی طرح علما کی موافقت یا مجتہدین کے اتفاق سے اگر کوئی چیز قانون میں درج کر دی گئی تو پھر مجتہد کو بھی اس کے خلاف عمل کرنا درست نہیں، کیونکہ اسلام میں افتا و قضا کا منصب موجودہ دور میں قانون اور کرپٹ کے منصب سے کسی طرح کم نہیں ہے، اور جس طرح قانون کے صدور کے بعد اشخاص کو چاہے وہ عوام ہوں یا خواص، علمائے قانون ہوں یا وکیل اور جج ہوں قانونی معاملات میں اپنی آرا و افکار کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا، بلکہ سب قانون کے پابند ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح علما و مفکرین اسلام کے اجماع یا شبہ اجماع یا اکثریت سے کسی بھی جائز مسئلہ کو مان لینے کے بعد اس مسئلہ کو ماننا تمام امت پر واجب ہوگا۔

(ز) کوئی صاحب یہ اعتراض نہ کریں کہ علمائے اسلام کا اجماع کسی معاملے میں ہو ہی نہیں پاتا، کیونکہ قانونی اور فقہی چیزوں میں اختلاف علم و تفقہ کی دلیل بھی ہے اور تفکیر انسانی کا شاہکار بھی۔ اسلامی شریعت کے علاوہ بھی دُنیا میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں جس میں کسی نہ کسی قانون دان، وکیل یا جج کو اختلاف نہ ہو۔ اس لیے اختلافات کا ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں اور نہ یہ اسلامی قانون کے اجراء میں تعویق کا سبب بن سکتے ہیں، کیونکہ علمائے اُمت کا اصولی طور پر یہ متفق علیہ فیصلہ ہے کہ اسلامی قانون نافذ ہو، اور پھر قانونی طور پر اختلافات فقہیہ کے باوجود علمائے حق کی اکثریت کا کیا ہوا فیصلہ قانونی مسائل میں نافذ ہوسکتا ہے، اور جمہوریت کے اس دور میں علمائے حق میں سے اکثریت کی رائے معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں ہے، یہ فیصلہ قانونی اشیا ہی میں ضروری بھی ہے۔

(س) اگر دوسرے مذاہب فقہ کے باشندے ملک میں موجود ہوں اور ان کے علما کی اکثریت دوسرے مذاہب فقہ سے تلفیق کے حق میں نہ ہو تو گو بظاہر یہ انتہائی افسوسناک بات ہوگی لیکن مذہبی حُرّیت اور فکری آزادی کی خاطر یہ

---

(۱) قواعد الاحکام فی مصالح الانام، لعبدالعزیز بن عبدالسلام جزء ۲ - صفحہ ۱۶۰

بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہر مذہب فقہ کے ماننے اور چاہنے والے کے لیے قانونی اعتبار سے فیصلے اسی کی فقہ کے مطابق ہوں۔ ایسا کرنے میں نہ کوئی عقلی قباحت ہے اور نہ کوئی شرعی مانع۔ میرے نزدیک پہلی صورت مستحسن ہے اور اسلامی وحدت کی رُو سے بھی اچھی ہے لیکن حُرّیت کے تقاضوں کے پیش نظر اس دوسری چیز کے ماننے میں بھی مجھے ہرگز انکار نہیں۔ لیکن قانون میں پھر یہ تصریح بے حد ضروری ہوگی کہ کوئی بھی وہ گروہ جو صرف اپنی فقہ کی روشنی میں فیصلہ چاہے گا، اسے کسی بھی مسئلے کے حل کے لیے کسی دوسرے مکتب فقہ سے استفادہ کرنے کی مطلق اجازت نہ ہوگی اور اس کے سارے قضیے اسی مذہب کے اقوال کی روشنی میں حل کیے جائیں گے چاہے ان میں کتنی ہی مشکل اور سختی ہو۔

۶۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کی وطنی حکومتوں کے لیے بھی اپنی جمہوریت کے تولنے کا وقت اور امتحان ہے کہ غیر وطنی اور سامراجی حکومتیں جب مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہ کر سکیں تو آئینِ جہانبانی اور دستورِ فطرت کے مطابق ہر عقیدے اور مذہب والے کو اس کے عقیدے اور اعمال میں جو حُرّیت کی ضمانت دی گئی ہے وہ وطنی حکومتیں اس طرح پُوری کر سکتی ہیں کہ سامراجی عہدِ حکومت میں مسلمانوں کے غصب کیے ہوئے حقوق واپس کریں اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتیں تو کم از کم ان حقوق اور قوانین ہی کو باقی رہنے دیں جنہیں غیر وطنی حکومت نے باقی رکھا تھا، اور خصوصی طور پر اسلامی عائلی قوانین کیونکہ یوں تو اسلام کا ہر قانون اپنی جگہ پر اٹل اور مستحکم ہے، لیکن بعض قوانین وہ ہیں جو مسلمانوں کے اقتدار اور اسلامی حکومت ہی میں نافذ ہو سکتے ہیں، جیسے قصاص، حدود، اسلامی تعزیرات وغیرہ۔ اور بعض دوسرے قوانین وہ ہیں جو ہر خطۂ زمین پر جہاں مسلمان آباد ہیں وہ نافذ ہو سکتے ہیں اور ان پر عمل کیا جا سکتا ہے، چاہے مسلمان غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہوں یا اقلیت میں ہوں یا کسی بھی سیکولر اسٹیٹ میں رہتے ہوں۔ جیسے عبادات، اخلاقیات اور وہ اجتماعی و عائلی قوانین جن کی رو سے حرام و حلال کی حدود متعین ہوتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی مذہب کا پیرو کسی بھی وضعی قانون کی رو سے حلال یا حرام کی ہوئی کسی چیز کو اپنا لے یا چھوڑ دے۔ کیونکہ مذہب ہی کی حلال کی ہوئی چیزیں اس کے نزدیک حلال ہیں اور مذہب کی حرام کردہ اشیا ہی اس کے نزدیک حرام ہیں۔ اس کا وجدان و ضمیر اور قلب و نظر اس کے علاوہ کسی دوسری بات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اور قانونی طور پر اگر اس کو منوا بھی لیا جائے تو شرعی طور پر گویا وہ ایک حرام کام کا مرتکب ہوگا۔ مثال کے طور پر وضعی قانون، میراث میں سے کسی کو ایک حق دلاتا ہے، لیکن شرعی طور پر اس کا حصہ کم ہے یا وہ سرے سے وارث ہی نہیں ہے۔ تو یہ مال اُس شخص کے لیے حرام ہوگا، اور حرام مال کھانے والے کا پیٹ آگ کا ایندھن بنے گا۔ دوسری مثال یہ کہ طلاق اسلامی طریقہ ہے، اگر قانون کسی مطلقہ جوڑے کے لیے یہ فیصلہ کرے کہ تمہاری طلاق نہیں ہوئی ہے، لیکن شریعت کا فیصلہ یہ ہو کہ ہو گئی ہے تو اب دونوں میاں بیوی فحش کاری اور زنا کے مرتکب ہوں گے، اور اصرار کے

ساتھ یہ عمل کرنے اور توبہ کی طرف رجوع نہ ہونے کی صورت میں زناکار خدا کی لعنت کا مستحق ٹھہرے گا۔ اس لیے اسلام کا عائلی قانون صرف اجتماعی اور سوشل قانون ہی نہیں بلکہ عقائد و عبادات کا ایک جزو ہے اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں گناہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی آزاد ملک میں رہنے والا مسلمان شخص یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ حکومت چاہے وہ اسلامی ہو یا سیکولر، اس کے عقائد و عبادات، قلب و وجدان، ضمیر و باطن اور حرام و حلال کے معاملات میں دخل اندازی کرے؟

۷۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں ان پر کسی نام نہاد اسلامی ملک کی قانونی بدعات کا مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں قانون سازی اسلام میں صرف خدا کا حق ہے اور انسان کتاب و سنت و اجماع کی روشنی میں خدا کے احکام کا استنباط کرتا ہے۔ اسلامی قانون کے ماخذوں میں کہیں یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ کسی اسلامی حاکم یا اسلامی ملک کا غیر اسلامی قانون بھی مسلمانوں کے لیے حجت بن سکتا ہے، بلکہ اس کے بالمقابل صاف صاف یہ اعلان ہے کہ "خدا کی معصیت میں کسی انسان کی اطاعت جائز ہی نہیں ہے"۔ اقلیت میں بسنے والے مسلمانوں کے پاس بھی کتاب و سنت موجود ہے، وہاں بھی علماء و فقہاء پائے جاتے ہیں، اور وہ براہ راست ایسے احکام کا استنباط شریعت کے اصولوں کی روشنی میں کر سکتے ہیں جو مشکلات حیات پر قابو پانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہوں۔

۸۔ مسلمان اقلیت کے لیے یہ حجت بھی بالکل غیر شرعی ہے کہ ملک کی غیر مسلم اکثریت نے اپنا مذہبی عائلی قانون بدل کر اس کی جگہ وضعی قانون شادی بیاہ اور میراث وغیرہ قبول کر لیا ہے، اس لیے اس ملک کی مسلم اقلیت کو بھی اسے قبول کر لینا چاہیے۔ کیونکہ اکثریت اپنا مذہب چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کے معاملہ میں آزاد ہے، اس کا جو جی چاہے کرے۔ لیکن اقلیت کے حقوق کو چھیننے کا وہ حق نہیں رکھتی۔ دوسری بات یہ کہ شاید اکثریت کے مذہب اور اس کے بانیوں اور مقننوں نے اس کی اجازت اپنے پیروؤں کو دی ہو کہ تم اپنے قانون عائلی میں تبدیلی کر سکتے ہو، لیکن شرع اسلام نے صاف صاف یہ حکم دیا ہے کہ یہ حدود الٰہیہ ہیں، ان سے آگے نہ بڑھنا اور کسی قسم کی غیر شرعی تبدیلی کے مجاز ہی تم نہیں ہو۔ اس لیے کسی انسانی قانون ساز کو کبھی یہ جراءت نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا کے مقرر کردہ احکام و قوانین کو بدلے۔ تیسری عقلی بات یہ ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین مسلمان کی نظر میں سارے وضعی قوانین سے بہتر ہیں اور عدل و عدالت دونوں اپنے اندر رکھتے ہیں (یعنی کسی ایک خاص شخص کے کیس میں بھی انصاف کرتے ہیں اور عام فطری اصولوں کی رو سے ہر ہر پیش آنے والے قضیے میں بھی حق و انصاف کی رعایت کرتے ہیں)، اور اس طرح زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ کسی غیر مسلم کی نظر میں یہ قوانین نعوذ باللہ ظالمانہ ہوں یا زمانے کا ساتھ دینے

کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو قطع نظر اس کے کہ بات عقل و منطق، تاریخ و تجربہ کے خلاف ہے، پھر بھی ہم یہی کہیں گے کہ سوسائٹی میں بہت سے دوسرے ظالمانہ مسائل موجود ہیں۔ آپ براہِ مہربانی ان کی طرف توجہ دیں، اور ہمارے مسائل کو ہمارے لیے چھوڑ دیں۔ کیونکہ جب امت اسلامیہ ان مفروضہ نقصانات کو بخوشی دلی برداشت کرنے کے لیے راضی ہے تو پھر یہ پرانی مثل صادق آتی ہے کہ جب میاں بیوی راضی تو پھر کیا کریں قاضی۔

۹۔ قوانین اسلامیہ کے سلسلے میں کتاب و سنت سے اجتہاد کے لیے علمائے امت ہی کی رائے وقیع ہو سکتی ہے۔ جبری احکام یا جلسوں، جلوسوں اور ووٹنگ کے ذریعے اس قسم کی قانونی باتیں طے نہیں ہو سکتیں۔ اگر کسی ملک کے چور یا رشوت خور یا بلیک مارکٹنگ کے دلدادہ اور اخلاق باختگی پر فریفتہ دیوانے کسی شہر میں جلسہ کریں اور ووٹنگ سے یہ پاس کرا دیں کہ یہ اخلاقی اور قانونی برائیاں، برائیاں نہیں بلکہ اچھائیاں ہیں، اور عیب نہیں بلکہ ہنر ہیں، تو کیا متمدن ان کی ہرزہ سرائی کو برداشت کرے گا؟ اور اگر کسی دوسرے ملک یا قانون سے یہ حجت بھی پیش کر دیں کہ وہاں بلیک کی عام اجازت ہے۔! فلاں بابی قانون میں اور فلاں ماڈرن سوسائٹی میں کنوارپن اور عفت و عصمت عیب سمجھے جاتے ہیں، اور حرام کاری، بیحیائی اور عیاشی ہنر اور فیشن ہے، تو کیا یہ بات کسی دوسرے اخلاق و ایمان سے آشنا ملک کے متمدن کے لیے نظیر کا کام دے سکتی ہے؟

۱۰۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کی حکومتیں اگر اسلامی حکومتوں کی تقلید ہی کرنا چاہتی ہیں تو اچھی باتوں میں کرنی چاہیے، مثال کے طور پر اکثر اسلامی ملکوں میں پرسنل لا میں مطلق تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اور بعض ملکوں میں شریعت کے پورے قوانین نافذ ہیں جن میں دیوانی و فوجداری سب شامل ہیں، اور بعض ممالک میں شریعت اسلامیہ کے مطابق سارے قوانین ڈھالنے کے اعلان ہو چکے ہیں اور کہیں ایکیں تیار ہیں۔ یا مثلاً مسلم ملکوں میں یہودی اور مسیحی اور دوسری اقلیتوں کا پرسنل لا اب تک محفوظ ہے اور کسی قسم کی تبدیلی اور ترمیم اس میں نہیں کی گئی ہے[1]۔ اس لیے وہ جمہوری ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انہیں اسلامی ممالک کے اس عظیم قانونی، اخلاقی برتاؤ کی روشنی میں سوچنا چاہیے جو وہ اپنی محکوم اقلیتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ یا پھر ہندوستان کی ساڑھے آٹھ سو سالہ تاریخ قانون پر نظر رکھی جا سکتی ہے جس میں کہیں بھی غیر مسلموں کے پرسنل اور عائلی قوانین، حتیٰ کہ عادات و رسوم تک کو ہاتھ نہ لگایا گیا تھا۔ اسی طرح عباسی، اُموی اور اندلس کی تاریخ قانون

---

[1] راقم انشاء اللہ اس سلسلے میں دو مضمون پیش کرے گا جن کا عنوان ہوگا "غیر مسلموں کے پرسنل لا کا تحفظ اسلامی تاریخ میں"۔ ایک میں مصر کی قدیم تاریخ سے یہودیوں کے شعائر ذبح کی آزادی کا قصہ بیان کیا جائے گا، اور دوسرے میں عصر حاضر میں مسیحیوں کی طلاق سے متعلق تفصیل پیش کی جائے گی۔

سے بھی یہ چیزیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔

۱۱۔ کیا ٹرکی کے لیے یہ بات افسوس اور محرومی کی نہیں ہے کہ شریعت میں جو تبدیلیاں سامراجی اور مسیحی حکومتیں نہ کر سکیں وہ اس نے کیں، اور جس ٹرکی نے چھ سو برس تک اسلامی اقتدار کی حفاظت کی تھی وہی آج ان اقدار کو توڑنے والا بن گیا؟ اور کیا یہ شرم و عار کا مقام نہیں کہ خود ترکوں کے بنائے ہوئے عائلی قوانین یہودی ملک اسرائیل اور مسیحی ملک لبنان کے مسلم باشندوں پر اب بھی نافذ ہیں، مگر جدید ٹرکی کی مسلم سوسائٹی ان سے محروم کر دی گئی ہے؟ سیکولر ہندوستان میں بھی انگریزوں کے زمانے کا مسلم پرسنل لا آج بھی نافذ اور جاری ہے؟ مگر بعض اسلامی ملک ان قوانین کی تبدیلی کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں؟ اور کیا سب سے بڑھ کر ستم یہ نہیں کہ ان نام نہاد اسلامی حکومتوں کے اقوال و اعمال و کردار کو حجت بنا کر اس کی روشنی میں مسلم اقلیتوں کے اسلامی پرسنل لا میں تبدیلی کی باتیں غیر اسلامی ممالک میں سوچی جاتی ہیں اور ان کو حجت بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اور اس طرح اقلیتوں کے محافظ، غم گسار اور سہارا بننے کے بجائے مسلم حکومتیں اور ان کے اعمال اقلیتوں کی محرومی اور دل شکنی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ (یہ بات پہلے لکھی جا چکی ہے کہ ان کے اعمال اور غیر اسلامی قوانین کسی کے لیے بھی حجت نہیں بن سکتے)۔

۱۲۔ تمام غیر مسلم اور قدیم قومیں اپنا رشتہ اپنے ماضی سے اور اپنے ناقابلِ عمل قانونی ورثہ سے جوڑنا چاہتی ہیں اور اسے فخر سمجھتی ہیں، اور عصرِ حاضر کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں اس میں طرح طرح کی تاویلات کرتی ہیں، بلکہ یوں کہیے کہ پاپڑ بیلتی ہیں۔ کیا مسلم اقوام کی بیداری کا وقت اب بھی نہیں آیا ہے؟

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (حدید - ۱۶)	"کیا ایمان والوں کے لیے (اب بھی وہ) وقت نہیں آگیا کہ ان کے دل ذکرِ الٰہی سے خشوع حاصل کریں، اور اس سے جو (دین) حق (خدا کی طرف سے) نازل ہوا"؟

کیا انہیں اپنے قدیم اور دائمی آسمانی حقائق سے آگاہی نہیں حاصل کرنی چاہیے؟ کیا انہیں اپنے تہذیبی ورثہ کی طرف نہیں لوٹنا چاہیے؟ دنیا میں پیدا شدہ مشاکل کا ازلی حل اور ابدی علاج جس اسلامی قانون میں موجود ہے کیا اس کو مکمل طور سے اپنانے کی سعی اخلاص و ایمان کے ساتھ انہیں نہیں کرنی چاہیے؟ اور اس طرح الجھنوں میں گھری ہوئی انسانیت کو مشکلات کے حل کرنے کا فطری طریقہ انہیں نہیں سکھانا چاہیے؟ اور کیا خدا کے بخشے ہوئے نور اور سلامتی کی راہ کا پرچار انہیں اقوامِ عالم کی حیرانیوں، اور گم کردہ راہ پگڈنڈیوں کے سامنے نہیں کرنا چاہیے؟ اور اقوامِ عالم کے لیے خدا کی

دی ہوئی اس ندا سے ان کے گوش آشنا نہیں کرنے چاہییں کہ :

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(مائدہ، ۱۵-۱۶)

"تحقیق آگیا تمہارے پاس (تمہارے) اللہ کی طرف سے نور اور روشن و واضح کتاب، اس کے ذریعے اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جو اس کی رضا کا تابع ہو، سلامتی کی راہوں کی، اور نکالتا ہے ان کو (زندگی کے) اندھیروں میں سے روشنی کی طرف، اپنے حکم سے، اور انہیں سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔"

بہرحال مختصر سے اس مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ دونوں سوالوں کا جواب دے دیا ہے۔ آخر میں اختصار کے ساتھ اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ یہ دونوں سوال فطری، عقلی، بدیہی اور قانونی و شرعی کسی بھی اعتبار سے صحیح نہیں ہیں کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی شخص اور قوم کا غیر آئینی عمل کسی بھی دوسرے شخص یا قوم کے لیے آئینی حجت نہیں بن سکتا، بالکل اسی طرح جیسے کسی شخص کے پیٹ میں اگر درد ہو تو یہ اس بات کے لیے دلیل نہیں بن سکتا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے سر میں بھی درد پیدا کیا جائے، یا اگر کسی ایکسیڈنٹ میں یا کسی ظالم و جابر غیر ملکی فرماں روا کے تشدد کی وجہ سے کسی شخص کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ہے تو اس کو اس بات کی سند نہیں بنایا جا سکتا کہ ضرور اس کی دوسری آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پیر اور دوسرے اعضا بھی تلف کیے جائیں۔ اس طرح کی منطق نہ صرف یہ کہ نادانی اور لاعلمی سے تعبیر کی جائے گی بلکہ شاید کوئی بھی صحیح الدماغ انسان اس قسم کی ہرزہ سرائی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ صرف یہی کہے گا کہ فوراً آپریشن کے ذریعے اس کی آنکھ ٹھیک کرنے کی پوری کوشش کی جائے، اور اگر خدانخواستہ وہ ٹھیک نہ ہو سکے تو اس کی دوسری آنکھ کی مکمل نگہداشت، حفاظت اور نگرانی کی جائے کہ کہیں اس کو مزید نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ بات عقلی طور پر کتنی ناقابلِ تسلیم اور مضحکہ خیز ہے کہ اگر کسی چور یا غاصب نے آپ کی گھڑی چرا لی ہے یا غیر قانونی طور پر آپ کی زمین ضبط کر لی ہے تو کوئی دوسرا ساہوکار یا ہمدرد ملک کے قانون ساز ادارے یا عدالت سے یہ مطالبہ کرے کہ ان کے گھر کا سارا سامان چرا لے جائے اور ان کے سارے مکانات، دکانیں اور زمینیں بھی ضبط کرنے کا قانونی حق عطا کیا جائے۔ یا یہ بات کس قدر عبرت ناک حد تک نادانی ہوگی کہ کوئی شخص یہ مطالبہ شروع کر دے کہ چونکہ ظالم و غاصب سامراج کی قانونی عدالت یا غیر قانونی حکومت نے فلاں ملک کے موجودہ فلاں وزیر اعظم یا قومی رہنماؤں کے خلاف جیل کی سزائیں دی تھیں اور ان میں سے کسی نے سولہ برس، کسی نے سولہ مہینے اور کسی نے سولہ دن ہی سہی جیل کی مشقتیں

برداشت کی تھیں، اس لیے اب سامراج کے چلے جانے کے بعد ان سارے پرانے قومی رہنماؤں تک کو جیل دی جائے جن کو سامراجی حکومت نے جیل کی سزا نہیں دی تھی اور دوسری طرف وہ رہنما جن کو سامراج کی عدالتوں نے سزائیں دی تھیں ان کو آزادی کے بعد بھی وزارت و امارت کی کرسیوں سے ہٹا کر دوبارہ جیل کی کوٹھریوں میں فوراً بند کر دیا جائے۔ اس قسم کی باتیں نہ صرف یہ کہ نادانی سے تعبیر کی جائیں گی بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہے تو اسے ڈاکٹری معائنہ کے بعد یا تو پاگل خانے بھجوا دیا جائے گا یا پھر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا اور جیل بھجوا دیا جائے گا۔

لیکن طرفہ تماشا یا ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ اسلامیات یا پرسنل لا کے سلسلے میں اس قسم کی باتیں کرنے کا نام ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقلمندی، روشن خیالی، دانائی، فیشن، ہنر، ریسرچ اور علم و تحقیق پڑ گیا ہے۔ بہرحال اس قسم کی غیر آئینی، غیر علمی، غیر عقلی، غیر فطری اور غیر شرعی باتیں کرنے والوں کے حق میں بھی ہم صرف دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اے فیاض ازل حکمت و شعور اور عقل و دانائی کی دولت نہیں نصیب فرما، اور قانون اسلامی کی خوبیوں کو سمجھنے کی بصیرت ان میں پیدا فرما، اور حقیقی اسلام کی چاشنی سے ان کے کام و دہن آشنا بنا تاکہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے اور مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہوئے اسلام کو نقصان نہ پہنچائیں بلکہ تیرے دین کے سچے خدمت گزار بن جائیں، اور غیر اللہ اور طاغوت کی قانونی بالادستی کے بھی منکر ہو جائیں، اور ان کے دلوں سے مغربی و مشرقی غیر اسلامی افکار، اقدار اور تہذیب کی محبت بھی نکل جائے کہ اسلامی قانون کے بروئے کار لانے میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن اسلام کے سیل رواں اور اسلام کی روشنی کے سامنے اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے، اور اب وہ وقت قریب آچکا ہے جب اسلامی ملکوں میں اسلام کا شمس تاباں پوری درخشانی کے ساتھ طلوع ہونے والا ہے، اور باطل کے سارے گھروندے خس و خاشاک بن کر بہ جائیں گے یا خاکستر ہو جائیں گے کیونکہ ان کی حقیقت مکڑی کے جالوں سے زیادہ نہیں ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۔ (عنکبوت۔ ۴۱-۴۳)

ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے سوا اولیا (محبوب، مددگار، شریک، حمایتی) دوسروں کو بناتے ہیں، ان کی مثال مکڑی کی طرح ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا اور سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے، اگر وہ سمجھتے۔ اللہ جانتا ہے جس کو پکارتے ہیں اس کے سوا کوئی چیز بھی، اور وہ زبردست حکمتوں والا ہے، اور یہ مثالیں (اور کہاوتیں) ہم لوگوں کے (فائدے) کے لیے بیان کرتے ہیں، اور ان کو سمجھتے (بوجھتے) وہی ہیں جو جاننے والے (سمجھ دار) ہیں۔

تحریکِ اسلامی کا کارکن

(سیّد اسعد گیلانی)

تحریکِ اسلامی اللہ کے بھیجے ہوئے نظامِ زندگی کو غالب و نافذ کرنے کے لیے پورے دینِ اسلام کو ایک مشن قرار دیتی اور اسے ایک عملی جد وجہد کی صورت میں لے کر اُٹھتی ہے۔ ایسی تحریک کے ساتھ کارکن کی حیثیت سے صرف وہی لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو اسلام پر دل سے ایمان رکھتے ہوں اور اسے غالب و نافذ کرنے کا مخلصانہ جذبہ اور داعیہ بھی رکھتے ہوں۔

اسلام کو غالب کرنے کا جذبہ و داعیہ ہر مسلمان میں ہو سکتا ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بڑھا ہو یا جوان، عالم ہو یا طالب علم، تاجر ہو یا ملازم، آزاد ہو یا غلام۔ بہر حال جس سینے میں بھی دینِ اسلام کی تڑپ ہو گی وہ ضرور دین کی سربلندی کی خاطر سپر ہو جانے کے لیے بیتاب ہو گا۔ اور وہ عمر کے جس دَور، یا زندگی کے جس دائرے میں بھی ہو گا، ضرور ہی اپنے مالک کے دیے ہوئے ہدایت نامے اور اپنے قبول کیے ہوئے دین کی اقامت کی خاطر تن من دھن سے اپنی استطاعت کی حد تک تگ و دو کرے گا۔ چنانچہ تحریکِ اسلامی کا کارکن وہی ہوتا ہے جو اسلام کے غلبے کے لیے کام کرے اور تحریک کے ساتھ مل کر کام کرے۔ جس مسلمان کے اندر یہ خوبیاں پائی جائیں وہ تحریکِ اسلامی کا کارکن ہی شمار ہو گا۔ چاہے وہ اپنے اس فرض کو مسجد میں خطبہ دے کر ادا کرے یا کسی درسگاہ میں طالب علموں یا اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنے معیاری کردار سے اسلام کی نمائندگی کر کے ادا کرے۔ ہر صورت میں یہ کام اسلام کی خدمت ہی ہو گا، ان کوششوں کا تیر ایک ہی سمت میں جائیگا اور اقامتِ دین کی منزل کے ایک ہی نشانے پر لگے گا۔

تحریکِ اسلامی کا کارکن باطل کے بگاڑے ہوئے ماحول میں بڑی نمایاں شخصیت ہوتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ پر وہ خوب جانا پہچانا اور شناخت کیا جاتا ہے، جس طرح کوئلوں کے ڈھیر میں روئی کا گالا پڑا ہوا صاف دکھائی دیتا ہے۔ لوگ اسے دُور سے پہچان لیتے ہیں اور دیکھ کر ہی بتا دیتے ہیں کہ وہ "جا رہا ہے تحریکِ اسلامی کا کارکن"۔ اسے اپنے نام و مقام کا تعارف کرانے کی ضرورت تو ہو سکتی ہے لیکن اپنے مسلک و مشن کا تعارف کرانے کی اسے کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ تحریک نے اگر معاشرے میں کچھ کام کر رکھا ہے اور لوگ تحریک کی علاماتِ شناخت سے روشناس ہیں تو پھر موافق و مخالف لوگ تحریک کے کارکن

کو بہت اچھی طرح شناخت کرتے ہیں۔ اس کو دیکھتے ہی تحریک اسلامی نظر آجاتی ہے اور اس کے بولتے ہی تحریک اسلامی بول پڑتی ہے۔

ایک میں تین شخصیتیں | تحریکِ اسلامی کے ہر کارکن میں تین شخصیتیں بہت نمایاں ہوتی ہیں۔ مُسلم، مُبلّغ اور مجاہد کی صفاتی شخصیتیں۔

مُسلم | وہ قول و فعل میں اُسی اسلام کے رنگ میں رنگا ہوا ہوتا ہے جس کا وہ علمبردار ہے۔ اس کے لیے بس اتنا جان لینا ہی کافی ہوتا ہے کہ اس کے خدا کا اس کے لیے کیا حکم ہے اور اس کے رسولؐ نے اسے کیا ہدایت دی ہے۔ بس اس کے بعد اس کے لیے اطاعت میں چون وچرا کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ وہ کھلے دل و دماغ سے اللہ اور اس کے رسولؐ کا تابعِ فرمان ہوتا ہے۔ اسے جھکانے کے لیے بس اتنا ہی کہنا کافی ہوتا ہے کہ یہاں اللہ اور اس کے رسولؐ نے جھک جانے کا حکم دیا ہے، اور اسے کھڑا کر دینے کے لیے اتنا ہی بتا دینا کافی ہوتا ہے کہ وہاں خدا اور اس کے رسولؐ نے کھڑا رہنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اُن کے حکم کا بندہ، اُن کا مطیعِ فرمان، اور اُن کے اشارے پر جان قربان کر دینے کا داعیہ اور حوصلہ رکھنے والا مستعد غلام ہوتا ہے۔ مسلم کی حیثیت سے کامل مطیعِ فرمان ہونے کی کیفیت تحریک اسلامی کے کارکن میں مختلف مدارج میں پائی جاتی ہے اور جس کارکن میں جس درجے میں یہ صفت پائی جاتی ہے اسی درجے میں وہ تحریک اسلامی کا اعلیٰ یا ادنیٰ کارکن ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ پورے فہم و شعور کے ساتھ اسلام کو زندگی کا مشن بنائے ہوئے ہوتا ہے اور وہ صحیح معنوں میں ایک نظریے کا علمبردار اور شعوری مسلمان ہوتا ہے۔

مُبلّغ | اس کے کردار میں دوسری شخصیت ایک مُبلّغ کی ہوتی ہے جو ہمہ وقت اور ہمہ پہلو گفتار و کردار سے تبلیغِ دین کا کام کرتا رہتا ہے۔ تبلیغِ دین کے لیے اس کے اوقات مقرر نہیں ہوتے۔ کوئی خاص مقامات متعین نہیں ہوتے۔ کچھ خاص افراد ہی قابلِ تبلیغ نہیں ہوتے۔ بلکہ موقع و محل اور حکمت و ضرورت کا اہتمام کرتے ہوئے تحریک اسلامی کا کارکن ایک ہمہ پہلو، اور ہمہ وقتی مُبلّغ ہوتا ہے۔ تبلیغ کے لیے مقرر یا ادیب ہونا بھی شرط نہیں ہوتا بلکہ خود بولنے کی عمدہ صلاحیت رکھنا بھی قطعاً لازم نہیں ہوتا۔ ایک گونگی عورت اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی توحید کے اعلان و اظہار کے لیے آسمان کی طرف خاموشی سے انگلی اُٹھا دیتی ہے تو اس کی یہ حرکت بھی اعلانِ توحید اور تبلیغِ الوہیت میں شمار ہوتی ہے۔ مُبلّغ اپنی ہر حرکت سے اپنی تحریک اور مشن کے حق میں تبلیغ کرتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت، لوگوں سے معاملات اور لین دین، دکھ درد میں شرکت اور ہمدردی و خیر خواہی غرض تبلیغ کی ہزار حکمتیں، ہزار شانیں اور ہزار انداز ہیں اور ہر انداز اپنے اندر خوبی و رعنائی رکھتا ہے۔ بعض اوقات مُبلّغ اپنے حسنِ اخلاق اور میٹھے بول سے ہی دلوں کی فصل

کاٹ لے جاتا ہے۔

سپاہی (مجاہد) تحریکِ اسلامی کے کارکن کے کردار میں پوشیدہ تیسری شخصیت ایک سپاہی (مجاہد) کی ہوتی ہے۔ وہ ایک مستعد، چاق و چوبند ہمہ وقت تیار اور تحریک کی ضرورت پر اُٹھ کر چل پڑنے والا شخص ہوتا ہے۔ عذرات اس کے دامن کو نہیں روک سکتے جس طرح کوئی عذر اسے نماز سے باز نہیں رکھ سکتا۔ وہ اپنے فریضے کو ادا کرنے کے لیے اپنی ساری مساعی صرف کرتا ہے۔ اس میں ایک سپاہی کی سی مستعدی، پابندیٔ نظم، توانائی و قوتِ کار، فرض شناسی، پھرتی، اطاعتِ امر اور حاضر باشی ہوتی ہے۔ وہ ایک عاشقِ جانباز کی مانند اپنے مشن کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے۔ وہ اپنی جان کو صرف خدا کی امانت سمجھتا ہے اور خدا کی راہ میں اس کا ایثار و قربانی کا جذبہ اور اس راہ میں آگے بڑھنے کے لیے اس کی فوری تیاری خود بتاتی ہے کہ وہ اپنے مشن کا ایک جانثار سپاہی ہے۔

میرے نزدیک ان تین شخصیتوں کو اگر ایک فرد میں جمع کیا جائے تو اس سے تحریکِ اسلامی کا کارکن وجود میں آتا ہے۔

دو امانتوں کا امین تحریکِ اسلامی کا کارکن اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے پاس اللہ کی دی ہوئی امانتوں میں سے دو سب سے بڑی امانتیں ہیں:

اسلام اور زندگی۔ اور ان دونوں عظیم امانتوں میں سے بھی وہ پورے شعور کے ساتھ جانتا ہے کہ ترجیح کسے حاصل ہے۔ وہ زندگی بچانے کی خاطر اسلام کو قربان کرنے پر کبھی تیار نہیں ہو سکتا لیکن اسلام کو بچانے اور پھیلانے کے لیے وہ زندگی قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ اس طرح اس کا مقصدِ زیست صرف اسلام کی سربلندی ہوتا ہے، دوسرا کوئی مقصد بھی اسلام کی سربلندی سے زیادہ بلند نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر انداز میں اسلام کی خدمت اور غلبے کے لیے ہی صرف کرتا ہے۔

اسلام کی خدمت کے لیے اس کی سب سے پہلی ضرورت تو اسلام کا وہ فہم و شعور اور علم و آگاہی ہے جس کے بغیر انسان اپنی پسند و ناپسند کو خدا اور رسولؐ کی پسند و ناپسند کے مطابق نہیں کر سکتا۔ اپنی دیگر تمام مصروفیات کے ساتھ اسے اسلام کے نظامِ زندگی سے ضروری اور کافی آگاہی مطلوب ہوتی ہے اور اپنی اسلامی شخصیت اور روح کی اس ضرورت کو وہ اسی تندہی اور توجہ سے پورا کرتا ہے جس طرح وہ اپنے جسم کی دیگر ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ کیونکہ جسم اگر اپنی ضروریات حاصل کیے بغیر زندگی کا راستہ طے نہیں کر سکتا تو روح بھی اپنی مطلوبہ ہدایت کی روشنی حاصل کیے بغیر راہِ ہدایت پر گامزن نہیں رہ سکتی۔

ذوقِ بلند | بلندیِ ذوق تحریکِ اسلامی کے کارکن کی خصوصیت ہے۔ جو شخص دنیا میں نظریات کے جنگل میں سے صرف اسلام کو ہی اپنے لیے مقصدِ زندگی کے طور پر قبول کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات کو ہی اپنے لیے سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتا ہے اور دنیا کے عیش و طرب اور نفسانیت کی لذات میں سے ایک صاف ستھری سیدھی سادہ پاکیزہ اسلامی زندگی کو ہی اپنے لیے لائحہ عمل کے طور پر قبول کرتا ہے وہ لازماً ایک بلند ذوق رکھنے والا انسان ہے۔ اس کی شان سے یہ بات فروتر ہے کہ وہ تحریکِ اسلامی کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی کمزوریوں کو اپنے لیے مثال بنائے اور ان کی خوبیوں سے صرفِ نظر کرے۔ وہ تو باغِ انسانیت میں پھولوں کی پسند رکھنے والا انسان ہے اور انسانیت کا سدا بہار پھول صرف نیکی بھلائی اور عملِ صالح ہے۔ وہ تو اپنے ساتھیوں کی اخلاقی کھیتی میں سے کانٹے چھوڑ دے گا اور پھول چن چن کر اپنی زندگی کا گلدستہ تیار کرے گا۔ یہی چیز ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ:

"دنیا کے معاملات میں اپنے سے نیچے کی طرف اور دین کے معاملات میں اپنے سے اوپر کی طرف دیکھو"۔

یعنی جو ساتھی دین کے اتباع اور پیروی میں سب سے بڑھ کر ہے جس کے اخلاق میں حسن و خوبی زیادہ درخشاں ہے اسی کو اپنے لیے بطور مثال قبول کرنا اسلامی تحریک کے کارکن کے ذوقِ بلند کے شایانِ شان ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی خوبیوں کو اپنے اندر جذب کر کر کے اپنے گلدستۂ اخلاق کو سب سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے اور جس قدر اس میں کامیاب ہوتا جاتا ہے اسی قدر وہ تحریک کا اچھا کارکن بنتا چلا جاتا ہے پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ خود بھی اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنے کردار کی اعلیٰ مثال پیش کرے۔ ہر دور کی تحریکِ اسلامی کے کارکنوں نے اپنے پیچھے اعلیٰ مثالیں چھوڑی ہیں۔ ایثار و قربانی کی مثالیں۔ تکلیف میں صبر و استقامت کی مثالیں۔ جاں فروشی کی مثالیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی مثالیں۔ جاں ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں کی مزاحمت کی مثالیں۔ یہ مثالیں ہر تحریک کا سرمایہ ہوتی ہیں اور بعد میں آنے والی تحریکوں کے لیے اپنی پیش رو تحریک کی یہ بہترین زندہ وراثت ہوتی ہے جس سے لوگ جذبہ، فہم، قوتِ کار اور تقویت حاصل کرتے ہیں۔ تحریکِ اسلامی کے اعلیٰ کارکن کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے قول و فعل و کردار کی اعلیٰ مثال قائم کرتا ہے اور تحریک میں جہاں جہاں اعلیٰ مثالیں موجود ہوتی ہیں ان سے بہترین استفادہ کرتا ہے۔

فہم و بصیرت و شعور | تحریکِ اسلامی کا کارکن ایک باشعور انقلابی کارکن ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کس چیز کے خلاف برسرِ پیکار ہے اور کس چیز کا جانثار ہے۔ وہ کس شے کو ختم کرنا چاہتا ہے اور کس کو ابھار کر سامنے لانا چاہتا ہے۔ وہ بیک وقت دینی، اخلاقی، انقلابی اور سیاسی ذوق رکھنے والا شخص ہوتا ہے۔ عبادات میں اس کے دینی ذوق کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ معاملات میں وہ اخلاقی حدود کی پوری پوری پاس داری کرتا ہے۔ باطل نظام کے مقابلے اور اسلامی نظام کو لانے

میں مخلص غیر مصالحانہ انقلابی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے، اور تحریک کو آگے بڑھانے اور اس کے لیے مختلف تدابیر سوچنے میں وہ سیاسی حکمتِ عملی سے بھی پوری طرح بہرہ ور ہوتا ہے۔ وہ کسی شیخِ طریقت کا اندھا مقلد نہیں ہوتا جو محض ایک طلسمِ خیال میں مبتلا ہو۔ وہ چشم بینا اور ذہن بیدار کے ساتھ نشاناتِ منزل کی شناخت کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں مسافر ہوتا ہے۔ وہ اس بات کا قائل نہیں ہوتا کہ

؎ بمے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسمِ منزلہا

نہ وہ کسی شیخِ طریقت کے اشارے پر اپنی جانماز شراب میں ڈبونے کے لیے تیار ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ جس کی وہ نماز پڑھتا ہے اس نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ اور نہ وہ اس بات کا قائل ہوتا ہے کہ آنکھیں بند کر کے پیرِ طریقت کی انگلی پکڑے بچے کی طرح چلتا چلا جائے، اس لیے کہ پیرانِ طریقت میں بعض "معلمانِ ملکوت" بھی ہوتے ہیں جو انسان کو بیخودی کا نشہ پلا کر اسے اپنی نفسانی اغراض کے طلسمِ ہوشربا میں گم کر دیتے ہیں۔ وہ اسلامی حکومت کی وفادار رعایا کی طرح ایک بیدار مغز فرد ہوتا ہے جو مہرِ قدغن کا حکم سن کر خلیفۂ وقت کو بھی ٹوک سکتا ہے اور اپنے رہنما کی رہنمائی ہمیشہ کتاب و سنت کے پیمانے سے ناپتا رہتا ہے۔ ایسا ہی کارکن کسی اسلامی تحریک کا وہ ہوشمند سرمایہ ہوتا ہے جو تحریک کو غلط موڑ مڑ جانے اور غلط راہیں اختیار کر لینے سے بچا سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ آگے چلنے والے کی راہنمائی و اطاعت، معروف کی شرط اور فہم و شعور کی کسوٹی کے ساتھ ہی قبول کرتا ہے۔

محاسبۂ نفس | تحریکِ اسلامی کا کارکن ہمیشہ اپنے محاسبۂ نفس کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ بیرونی روک ٹوک سے پہلے اپنا جائزہ خود لیتا رہتا ہے۔ اپنے حقیقی مالک کے ساتھ اپنے تعلق کو خود ناپتا رہتا ہے۔ اپنے مشن کے ساتھ اپنی وفاداری اور کارکردگی کو خود تولتا رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے خود سوال کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے مقصدِ زندگی کے لیے کس قدر ایثار و قربانی کر رہا ہے اور جس تحریک کو اس نے اپنی زندگی کا راستہ قرار دیا ہے اس راستے پر اس کے قدم کس رفتار سے آگے بڑھ رہے ہیں؟ اپنے ساتھیوں سے اس کے تعلقات کیسے ہیں؟ اپنے رفقاء سے اس کی رفاقت کا کیا حال ہے؟ اپنے قول کے مقابلے میں اس کے فعل و عمل کا کیا تناسب ہے؟ جن کو اس نے اپنا ساتھی بنایا ہے ان سے رفاقت کے تقاضے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا اس نے کتنا اہتمام کیا ہے؟ جس بات کو وہ سچا سمجھتا ہے اس کے پھیلانے میں اس کی کتنی قوت صرف ہوتی ہے؟ جس شے کو وہ غلط قرار دیتا ہے اس سے بچنے کا اہتمام وہ خود کتنا کرتا ہے؟ غرض اپنے ضمیر کے سامنے یا تو وہ سُرخرو ہے یا مجرم۔ اگر مجرم ہے تو کس بات کا مجرم ہے اور اس جرم سے بچاؤ کا اس نے کیا اہتمام کیا ہے؟ محاسبۂ نفس

تحریک اسلامی کے کارکن کے لیے ایک داخلی پیمانے اور ترازو کا کام دیتا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو تول کر دیکھ سکتا ہے کہ اس کا وزن تحریک کے پلڑے میں کس قدر ہے۔ اس وزن کی کمی بیشی کے بارے میں جس صفائی، وضاحت اور انصاف کے ساتھ اس کا اپنا ضمیر اسے بتا سکتا ہے دوسرا کوئی نہیں بتا سکتا اور اسی کا اہتمام اسے تحریک کے لیے ایک مفید اور مؤثر کارکن بننے میں مدد دے سکتا ہے۔

منصوبہ بند اور منضبط کام | تحریک اسلامی کا کارکن جس تصورِ حیات کا قائل ہے اس کے لحاظ سے اس کا گزرتا ہوا ہر لمحہ اور اس کا کیا ہوا ہر کام خدا کے سامنے ناپا اور تولا جائے گا۔ اس احساس کی بنا پر وہ اپنے اوقات اور قوتوں کو بہترین انداز میں صرف کرتا ہے۔ جو قوت بھی اللہ نے اسے دی ہے وہ اسے اللہ کی راہ میں ضرور صرف کرتا ہے۔ تحریر و تقریر کی قوت، گفتگو اور مذاکرے کی صلاحیت، جسم و جان کی توانائی، علم و تدبیر کا ذخیرہ، اور مال و اسباب کے ذرائع سب کچھ وہ بہترین انداز اور ترتیب سے اپنے مقصدِ حیات کے لیے کام میں لاتا ہے تاکہ اس کی کوئی قوت بھی ضائع نہ ہو، نہ بیکار رہے اور نہ بے موقع صرف ہو۔

وہ ذہنی یکسوئی سے کام کرتا ہے۔ تقسیمِ کار کے اصولوں کو سامنے رکھتا ہے۔ وقت کی پابندی کا لحاظ رکھتا ہے۔ کام کی مقدار اور وقت کی وسعت کو ملحوظ رکھتا ہے اور اپنا کام اس طرح سرانجام دیتا ہے کہ کم سے کم وقت میں بہتر سے بہتر کام سرانجام پا سکے اور وقت کو اس طرح تقسیم کرتا ہے کہ سارے ضروری کام بروقت اور خوبی کے ساتھ انجام پاتے رہیں اور اس کی قوتوں کی کوئی رمق اور اس کے اوقات کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہو۔

بارآور درخت کے مانند | تحریکِ اسلامی کا ایک اچھا کارکن ایک بارآور درخت کے مانند ہوتا ہے جس سے تحریک ثمر حاصل کرتی رہتی ہے۔ وہ معاشرے میں نفوذ کر کے اپنے دائرۂ کار میں اپنے ساتھی تلاش کرتا رہتا ہے۔ اصلاح کا عمل ایک خاموش مشین کی طرح اس کے ذریعے بروئے کار آتا رہتا ہے۔ وہ جب تحریک سے وابستہ ہوتا ہے تو اپنے دائرۂ اثر میں اس کے اثرات پھیلنے لگتے ہیں۔ لوگ اس سے متاثر ہو کر تحریک کی طرف آتے رہتے ہیں۔ بیسیوں لوگ ہوتے ہیں جو اس کے ذریعے اپنی آمد کا اعلان و اعتراف کرتے ہیں۔ اس کی زندگی سے سبق سیکھتے ہیں۔ اس کے طرزِ عمل سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی گفتگو سے تحریک کے نصب العین کے قائل ہوتے ہیں۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر تحریک کی کشتی میں سوار ہو جاتے ہیں۔ یہی اس کے بارآور ہونے کی علامت ہے کہ وہ ایک باغ کے ثمردار درخت کی طرح تحریک کے دامن میں اپنے پھل مسلسل ڈالتا چلا جاتا ہے۔

اخلاق کے عمومی خدوخال | تحریکِ اسلامی کا کارکن ایک خوش اخلاق، خوش اطوار، خوش گفتار، اور خوش طبع آدمی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہی خوبیاں اسے معاشرے میں نفوذ اور اصلاحِ افراد کے کام میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ بدمزاج،

غصہ ور، علیحدگی پسند، چڑچڑا اور آتش مزاج آدمی تحریک میں مفید کارکن ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ رابطہ و تعلق میں یہ چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں۔ کارکن کے اندر دلنوازی کی صفت بدرجۂ اتم موجود ہونی چاہیے۔ یہ نہ ہو تو ساتھیوں کو باہم جوڑنے والا مسالہ فراہم نہیں ہوتا۔ ایسا نہ ہو کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

خوئے دلنوازی کے بغیر تحریکیں چلانا بھی مشکل ہوتا ہے اور چل پڑیں تو انہیں سمیٹ اور جوڑ کر باہمی پیوست رکھنا اور زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کارکن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مختلف علوم حاضرہ سے مناسب حد تک آگاہ ہو، تاکہ ہر نوعیت کے مخاطب سے وہ دعوتِ اسلامی کا تعارف کرا سکے اور مختلف نوعیت کی ذہنی الجھنوں کو صاف کر سکے۔ اسے پُراعتماد اور حق پرست ہونا چاہیے تاکہ اس کی شخصیت مخاطب پر اثر انداز ہو سکے، اس کی حق پرستی سے لوگ پورے پورے غیر جانبدارانہ طرزِ عمل اور انصاف کی توقع رکھ سکیں، اور کسی بے جا عصبیت اور ہٹ دھرمی میں مبتلا انسان محسوس نہ کریں۔ اسے بے جھجک اور بے لاگ بھی ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ خندہ رُو اور خوش خُلق بھی تاکہ اس کی طبیعت کی خشکی اور یبوست دعوت سے متاثر ہو کر قریب آنے والوں کو دُور نہ پھینک دے۔ اسے ہمدرد اور خیر خواہ ہونا چاہیے اور اس کی خیر خواہی اس کی بات چیت، طرزِ عمل اور برتاؤ سے واضح طور پر محسوس ہونی چاہیے۔ ان خوبیوں سے وہ اپنے مخالف کے دل میں گھسنے کا راستہ بنا سکتا ہے۔ اس لیے کہ دل کا دروازہ وُہ سنگین دروازہ ہے جسے باہر کی طرف سے کسی بڑی سے بڑی ضرب سے بھی کھولا نہیں جا سکتا جب تک کہ اندر کا مکین آنے والے مہمان کی خوبی سے متاثر ہو کر خود آگے بڑھ کر اس کے لیے اندر کی کنڈی نہ کھول دے۔

اس کے علاوہ اسے اپنے ساتھیوں کے بارے میں سُوءِ ظن سے بھی بچنا چاہیے، جب تک کہ بدظنی کی کوئی ٹھوس وجہ موجود نہ ہو۔ اور اگر ایسی وجہ موجود بھی ہو تو اس کی غیر حاضری میں اس کا ذکر اور چرچا کرنے سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہیے اس لیے کہ پیٹھ پیچھے کی بات پیٹھ میں خنجر گھونپنے سے زیادہ بڑا گھاؤ لگانے والی چیز ہوتی ہے۔ اپنے ساتھیوں کو تحفہ و ہدیہ کا اہتمام بھی دلوں کو جوڑتا ہے اور ان کے بارے میں نیک گمان اور اعتماد بھی باہمی تعلقات کو مضبوط بناتا ہے۔ باہمی تعلقات میں کسر و انکسار کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کسی حق پرستی کا نام نہیں ہے جس سے انسان نئے ساتھی بنانا تو درکنار پرانے ساتھیوں تک کو قربان کر بیٹھتا ہے۔ اپنے رفقاء اپنے دوست ہی ہوتے ہیں اور دوستوں کو اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کا بہترین ذریعہ رفاقت اور دوستی کا تعلق ہی ہے۔ محض ضابطہ کا تعلق تو ایک

ایسا کچا تاگہ ہوتا ہے جو جذبات کے ذرا سے کھنچاؤ سے ٹوٹ جاتا ہے۔ جو لوگ صرف ضابطے کے سہارے تحریکیں چلاتے ہیں وہ کبھی اپنے ساتھیوں کو سنبھال اور سمیٹ کر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ حضورؐ کا طرزِ عمل اپنے ساتھیوں سے اخوت، محبت، شفقت، احسان اور مہر و وفا کا طرزِ عمل تھا نہ کہ محض ضابطے کا تعلق۔ ضابطے کے تعلقات سے نہ انقلابی قربانیاں دی جاسکتی ہیں اور نہ انقلابی کارنامے سرانجام پا سکتے ہیں۔ سلطان باہو نے دل کی دنیا کے بارے میں کیا خوب بات کہی ہے۔

ع دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانے ہُو

جو کارکن اپنے ساتھیوں کو اپنی مٹھی میں لینے میں ناکام رہ جاتا ہے اور جو ساتھی اپنے ساتھیوں کے دلوں میں بھانک کر ان میں اُٹھنے والی لہروں کو نہیں پہچان سکتا وہ خود بھی ناکام رہتا ہے اور اس کے ساتھی بھی اپنا حقِ رفاقت ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ باہمی تنبیہ و محاسبہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے جو تحریک کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو تحریک میں خرابیاں پرورش پاتی رہتی ہیں اور آخر کار پوری تحریک کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ لیکن یہ کام نہ دشمنی نکالنے کے لیے کرنا چاہیے اور نہ دشمنی پیدا کرنے کے لیے ہونا چاہیے، بلکہ اس کا مقصد تو باہمی خیر خواہی اور بگاڑ کی اصلاح ہے۔ جو محاسبہ اور احتساب خرابی پیدا کرے وہ حکمت سے خالی ہے، اور جو تنقید ساتھیوں کو توڑنے کا کام کرے وہ قصائی کا چھرا اور قصاب کا بغدا ہے۔ حدیثِ رسول کی رو سے مومن کو مومن کا آئینہ ہونا چاہیے۔ اور آئینہ کا کام بلاکم و کاست اور بلا تبصرہ و طعن حقیقت کو سامنے رکھ دینا ہے۔ اس کام میں آئینہ پیشانی پر بل تک نہیں لاتا۔ اور نہ آئینہ میں اپنی صورت پر کوئی داغ دیکھنے والا اُلٹا آئینے ہی پر بگڑ بیٹھتا ہے۔ دوسروں کی غلطیوں کو چننا پھر سمیٹنا اور پھر ان کو پھیلا اور پھُلا کر ان کا چرچا کرنا تحریک کو کانٹوں میں گھسیٹنے اور اس کی روح کو مضمحل کر دینے کے مترادف ہے۔ اور اپنی غلطی کی نشان دہی پر مشتعل ہو جانا بھی تحریک کے لیے کچھ کم تباہ کن نہیں ہے۔ اسی طرح تعلقات میں باہمی کسر و انکسار کا معاملہ ہے۔ اپنے ساتھی کے لیے جھک جانا اور اس کی رعایت کرتے ہوئے اس کا کچھ بوجھ برداشت کر لینا باہمی پیوستگی کے لیے نہایت لازمی ہے۔ ایک ساتھی ایک وقت دوسرے کی بات برداشت کرے گا تو دوسرا بھی کسی دوسرے وقت اس کی بات برداشت کرے گا۔ اسی طرح باہمی برداشت تحریک کے اندر ایک روایت کے طور پر چل سکتی ہے۔ یہ کوئی یکطرفہ ٹریفک نہیں ہے۔ اسی طرح باہمی تعلقات کو کاغذی اور ضابطے کے تعلقات سے آگے بڑھا کر انہیں حقیقی زندہ تعلقات کی صورت میں استوار کرنے سے ہی پائدار رفاقت وجود میں آتی ہے۔ کسی کے دکھ میں شرکت، کسی کے غم میں غم گساری،

کسی کی شادی میں شرکت، کسی کی بیماری میں عیادت، کسی کو ہدیہ، اور کسی کو پیغام خیریت، غرض ایک زندہ تعلق جو ایک برادری کے افراد میں ہوتا ہے، وہی تحریک کے لیے پائدار زندگی کی ضمانت ہے۔

کتاب و کاغذ سے کوئی مضبوط رشتے استوار نہیں ہوتے، بلکہ عمل و کردار سے رشتے قائم ہوتے ہیں۔ کتابیں الماری میں اکٹھی رہ کر بھی علیحدہ رہتی ہیں اور انسان علیحدہ گھروں میں رہ کر بھی ایک دوسرے کے دل کے قریب رہ سکتے ہیں۔ پائدار رفاقت تعلقات کی رفاقت ہی ہوتی ہے، ورنہ لوگ بچھڑتے ہیں تو باہمی شناخت و پہچان سے بھی عاری ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریک اسلامی کا کارکن اپنے دور میں معاشرے کا ایک نہایت ہی قیمتی فرد ہوتا ہے اور جب وہ ایک نصب العین کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے تو اس کی گاڑی کو اپنی پوری قوت سے کھینچتا ہے اور اس کی کشتی کو اپنے بازوؤں کی پوری توانائی کے ساتھ بادِ مخالف کے پیدا کردہ گردابوں سے اعلیٰ درجے کی ہمت و جرأت کے ساتھ نکال لے جاتا ہے۔ ایسے کارکن اگر تھوڑی مقدار میں بھی کسی اسلامی تحریک میں جمع ہو جائیں تو وہ تاریخِ دعوت و عزیمت کا سرمایہ بن جاتے ہیں، اور اگر بڑی تعداد میں میسر آجائیں تو تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ کر اسے اپنے انقلاب کی منزل تک لے جانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں

بقیہ اشادات :

جس طرح کہ دوسرے فرمانرواؤں کی گئی تھی۔ پھر ہم اس بات کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ تحریک آزادی فلسطین کی باقی [illegible] رہنماؤں کو جو یاسر عرفات کی تنظیم سے کسی طرح کم مؤثر نہیں، کن مصالح کے تحت نظر انداز کر دیا گیا۔

(بقیہ اشارات) وزیر اعظم سے یہ بات مخفی نہیں کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے خود الگ نہیں ہوا بلکہ بھارت اور مغرب کی اسلام دشمن طاقتوں، خصوصاً بھارت اور روس کی سازشوں سے یہ المیہ رونما ہوا ہے۔ اس کام میں بھارت کے ہندو، پاکستان کے سوشلسٹ اور دوسرے لادین عناصر روس کی سرپرستی میں ہمہ تن مصروف تھے کہ کسی طرح دین کی اساس پر قائم ہونے والے اس ملک کی تباہی کا سامان پیدا کیا جا سکے۔ ان لوگوں کے مذموم عزائم کے پیچھے تین محرکات کارفرما ہیں۔ ایک چین کے مقابلے میں مشرق کے اندر عظیم بھارت کی تشکیل جس کے ذریعے امریکہ اور روس کے سامراجی مفادات کی تکمیل ممکن ہو۔ دوسرے اسلام کی عملداری کا خاتمہ اور اس سے ملت اسلامیہ کے شیرازہ کو منتشر کرنے کا ناپاک منصوبہ اور تیسرے دونوں بازوؤں میں آمریت کے تسلط کی راہ کی ہموار۔ اسلام دشمن طاقتیں ان تینوں مقاصد کی تکمیل کے لیے برسوں سے مصروف عمل تھیں، جن کے نتائج اب کھل کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ ان حالات میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود آگے بڑھ کر ان طاقتوں کو یہ موقع فراہم کر رہے ہیں کہ وہ بڑی آزادی بلکہ ہماری رضامندی کے ساتھ ان خوفناک منصوبوں کو کامیابی کے مراحل تک پہنچائیں۔

اخلاقی اور قانونی اعتبار سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطلب بجز اس کے کیا ہے کہ جارح ہندوستان کو، جسے اقوام متحدہ کے ۱۰۴ ممالک نے بھی جارح قرار دیا ہے، نہ صرف جارحیت کے الزام سے بری تسلیم کیا جائے بلکہ اسے بنگلہ دیش میں "آزادی" کی جنگ کرنے والوں کا نجات دہندہ مانا جائے اور اس طرح استعماری طاقتوں کو یہ راستہ دکھایا جائے کہ پہلے پاکستان کے کسی حصے میں علیحدگی کے رجحانات کی پرورش کرو اور پھر جب چند سرپھرے باہر کی قوتوں کا اشارہ پا کر اس حصے میں شورش برپا کر دیں تو اسے آزادی کی جنگ کا مقدس نام دے کر ان شورش پسندوں کی تائید کے لیے اپنی مسلح افواج کے ساتھ آ دھمکو اور اس طرح اس حصے پر قابض ہو جاؤ اور پاکستان سے یہ مطالبہ کرو کہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے ناجائز قبضے کو صحیح اور درست مان لے۔ ممکن ہے بھٹو صاحب بھارت کے بارے میں کسی خوش فہمی میں گرفتار ہوں لیکن جو لوگ بھارت کی سامراجی ذہنیت سے واقف ہیں ان کے لیے یہ باور کرنا قریب قریب ناممکن ہے کہ بھارت اور اس کے روسی آقا صرف مشرقی پاکستان کو ہضم کر کے سیر ہو جائیں گے اور ان میں ھل من مزید کی کوئی حرص باقی نہ رہے گی۔ بھارت نے اس سے پیشتر جونا گڑھ پر ہاتھ صاف کیے، کشمیر پر ناجائز قبضہ جمایا، حیدرآباد کو ہڑپ کیا اور اس کی جوع الارض میں کوئی کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔ وہ آہستہ آہستہ ارد گرد کی ریاستوں کو نگل جانے کے درپے ہے۔ اور وہ خود بھی اور اس کا مربی روس بھی پوری ڈھٹائی کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان میں جہاں کہیں بھی آزادی کی کوئی تحریک ابھرے گی وہ اسی طرح نجات دہندہ بن کر اس کی حمایت پر آئیں گے جس طرح کہ بنگلہ دیش کے لیے میدان عمل میں اترے ہیں۔ ہم محترم وزیر اعظم سے دریافت کرتے ہیں کیا وہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان نئے اندوہناک حقائق کو، جنہیں یہ سامراجی قوتیں مناسب مواقع پر جنم دیتی رہیں گی، تسلیم کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ اگر آپ اتنے ہی حقیقت پسند

ہیں تو کیا یہ مناسب نہ تھا کہ جس جماعت نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے تھے اُسے مسندِ اقتدار پر فائز ہونے کا موقع فراہم کرتے۔ پھر آپ یہ بھی فرما رہے ہیں کہ آپ نے یہ فیصلہ دوستوں کے مشورے سے کیا ہے۔ کیا اس فیصلے کے لیے وہ وقت زیادہ موزوں اور مناسب نہ تھا جب پولینڈ کی قرارداد کے ذریعے ایک ایسی صورت پیدا ہو سکتی تھی جس سے ملک تقسیم ہونے سے بچ جاتا مگر آپ اس قرارداد کو پھاڑ کر اور بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے ملک میں لوٹ آئے۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر آپ بنگلہ دیش کے معاملے میں کیوں اتنے حقیقت پسند ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو مگر ہمیں یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں آزاد بلوچستان، پختونستان اور سندھو دیش بھی سامراجی طاقتوں کے اشارے پر حقائق کی صورت میں ہمارے سامنے نمودار نہ ہونے لگیں اور پھر ہم ان حقائق کو بھی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیے جائیں۔

بنگلہ دیش کے مسئلہ پر آپ کی تقریر دلپذیر سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بنگال کے مسلمانوں سے ایک سال کی جدائی نے آپ کے اندر ان سے ملنے اور اُن کے ساتھ شیر و شکر ہونے کی تڑپ پیدا کر دی ہے۔ یہ ایک بڑا نیک جذبہ ہے اور دو بچھڑے ہوئے بھائیوں کو ملانے کی خواہش بڑی مقدس خواہش ہے لیکن اس ضمن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ آخر اس نیک جذبے کا اُس وقت کیوں مظاہرہ نہ کیا گیا جب آپ کے معمولی ایثار سے جدائی کے امکانات ہی معدوم ہو سکتے تھے۔

شیخ مجیب الرحمٰن جس مزاج کے آدمی ہیں اور وہ اِس وقت جس طرح اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے بھارت کے دست نگر ہیں، کیا ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی اس بات کا کوئی امکان موجود ہے کہ ہم بنگال کے مسلمانوں کو اپنے قریب لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بھارت ہماری ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھے گا اور وہ ایک لمحہ کے لیے ہمارے کسی ایسے طرزِ عمل کو گوارا نہ کرے گا جس سے مشرقی بنگال کے مسلمان بھارت کے اثر سے آزاد ہو کر پاکستان کے اثر میں آجائیں۔

بنگلہ دیش بھارت کی غلامی میں جس طرح جکڑا ہوا ہے اُس کا ممکن ہے عوام کو اندازہ نہ ہو مگر آپ تو اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ۲۵ سالہ معاہدے کی رُو سے بنگلہ دیش کی تجارت، اس کی خارجہ پالیسی، اس کا نظامِ زر، سب بھارت کے تابع ہیں۔ بنگلہ دیش بھارت کی اجازت کے بغیر اپنی کوئی فوج نہیں رکھ سکتا۔ بھارت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ جب چاہے بغیر کسی نوٹس کے بنگلہ دیش میں اپنی فوج داخل کر دے۔ ان حالات میں بنگلہ دیش کے عوام کے ساتھ کوئی راہ و رسم پیدا کرنے کا خیال ابلہ فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔

ہم بھٹو صاحب کے اس رویہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پاکستان سے علیحدگی کے سب سے بڑے علمبردار اور اُن کے حامیوں سے تو تعلقات استوار کرنے کے لیے وہ سخت بیتاب ہیں لیکن انہیں اُن مسلمانوں کے دُکھ درد کا کچھ احساس نہیں جنہوں نے ایک پاکستان کے

قیام کے لیے بے مثال قربانیاں دیں اور جو آج بھی اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ وہ بھارت کے چنگل سے نکل کر پاکستان سے ساتھ شامل ہو جائیں۔ ان لوگوں کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ مجیب الرحمٰن کے قول کے مطابق ایک کروڑ ہے اور اس کشمکش میں برسرِ اقتدار پارٹی کے اخبار کی اطلاع کے مطابق قریب قریب ایک سو نمایاں افراد قتل ہو چکے ہیں۔ یہ سب حقائق کیا اس بات کا ثبوت فراہم نہیں کر رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان اس زبردستی قائم ہونے والے بنگلہ دیش سے راضی نہیں۔ اس حالت میں کیا ہمارا اس ناجائز ریاست کو تسلیم کرنا ان بے چاروں کی پشت میں چھرا گھونپنے کے مترادف نہیں۔

بنگلہ دیش کو تسلیم کرتے ہوئے اُن بہاریوں کو بھی نگاہ میں رکھنے کی ضرورت تھی جو پاکستان کی خاطر پہلے ۱۹۴۷ء میں برباد ہوئے اور اب ایک پاکستان کی حمایت کے جرم میں بنگال کے لادین عناصر کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ ان بے چاروں کا کس وسیع پیمانے پر قتل ہُوا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بنگلہ دیش کی حکومت کے ایک ترجمان کے مطابق ۳ لاکھ ۲۰ ہزار بہاریوں نے اپنے مستقبل کا فیصلہ مُعلّق رکھا ہے۔ ایک لاکھ ۴۰ ہزار بنگلہ دیش میں رہنے پر مصر ہیں اور ایک لاکھ ۸۰ ہزار نے مغربی پاکستان میں آباد ہونے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ مشرقی پاکستان میں بہاریوں کی کُل آبادی ۳۵، اور چالیس لاکھ سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ اگر ہم ۳۵ لاکھ ہی تسلیم کرلیں تو ان چھ لاکھ بہاریوں کے علاوہ باقی ۲۹ لاکھ کہاں گئے۔ کیا اُنہیں زمین نگل گئی یا آسمان اُچک کر لے گیا۔ اگر مشرقی پاکستان کے بپھرے ہوئے لادین عناصر نے اُنہیں موت کے گھاٹ نہیں اُتارا تو انہیں کیا ہُوا ہے۔ کیا یہ بیچارے اس بات کے مستحق نہیں کہ ہم ان ستم زدوں کی دلجوئی کرتے ہوئے ان عناصر کو اپنے سے دُور رکھنے کا التزام کریں جنہوں نے ہندو کے ایما پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی ہے۔

جس ڈرامائی انداز سے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی فوج کے جذبات اور صوبائی حکومت کے ان کارکنوں کے احساسات کو کبھی کسی لحاظ سے قابلِ التفات نہیں سمجھا گیا جنہوں نے بھارتی جارحیت کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور نہایت پُر آشوب حالات میں مشرقی پاکستان کے انتظام و انصرام کو سنبھالا۔ کیا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بعد ہماری فوج اور انتظامیہ کے اندر داخلی اور خارجی شورشوں کو پوری قوت سے دبانے کا کوئی داعیہ باقی رہے گا۔ کیا وہ اس فیصلے کے بعد اس انداز پر سوچنے میں حق بجانب نہ ہوں گی کہ شورش پسندوں کی سرکوبی کرنے کے بجائے خاموش تماشائی بن کر حالات کا رُخ دیکھتے رہو اور اگر شورش پسند قوت و طاقت حاصل کرتے نظر آئیں تو پھر اُن کے ساتھ شامل ہو کر آزادی کے علمبردار بن جاؤ۔ بھٹو صاحب نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرتے ہوئے یہ تو فرمایا ہے کہ انہوں نے یہ قدم دوستوں کے مشورے سے اٹھایا ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ پاکستان کے اس دوست کا اس بارے میں کیا ردِّ عمل ہے جس نے ہماری ہر آڑے وقت میں مدد کی اور جو روس کی اس شاطرانہ چال کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کس طرح وہ ایک منصوبے کے تحت بھارت کی وساطت سے اُس کے